

حجاب اور بے حجابی

از

زعیم اسلام امیر شکیب ارسلان

مترجمہ جناب حکیم سید محمد شعیب صاحب

چند سال ہوئے عالم اسلامی کے مشہور لیڈر امیر شکیب ارسلان کا ایک مضمون مصر و شام اور دوسرے ممالک کے عربی اخبارات میں شائع ہوا تھا جس میں خواتین اسلام کی تعلیم اور ان کی آزادی کے حدود پر صحیح اسلامی نقطہ نظر بیان کیا گیا تھا معلوم نہیں کہ ہندوستان تک بھی وہ پہنچایا نہیں گیا۔ میں نے نیویارک کے جریدہ ”ال بیان“ سے اس مضمون کا اقتباس کیا ہے۔ امید ہے کہ ناظرین ترجمان القرآن دیکھی کے ساتھ اس کا مطالعہ فرمائیں گے۔ یہ ملاحظہ خاطر رہے کہ امیر شکیب ارسلان کی رائے کسی ”ٹما“ ایک خیال پرانے ملائی رائے سمجھ کر نظر انداز نہیں کی جاسکتی۔ بلکہ یہ ایک ایسے شخص کی رائے ہے جس کو یورپ کی سیاحت اور یورپین تہذیب کے مطالعہ اور اساطین تہذیب مغربی کے ساتھ مبادلہ خیال کے اتنے مواقع ملے ہیں جتنے شاید ہی۔ ہندوستان، ایران، مصر اور یورپ کے کسی شخص کو ملے ہوں گے اور اس کے ساتھ یہ بھی بلا مبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ مشرق کے بہت کم لوگوں کی نظر موجودہ زمانے کے عمرانی و سیاسی مسائل میں اتنی گہری ہوگی جتنی امیر موصوف کی ہے۔ (جمہوشیب)

اب سے تقریباً تین سال پہلے کا واقعہ ہے کہ جرتنی میں زندگی بہت سستی ہو گئی تھی۔ ایک عالمِ دہاں کے کالجوں میں دو یا تین گنی ماہوار پر باسانی گذر کر سکتا تھا۔ میں نے اس موقع سے فائدہ

اٹھایا، اور اپنے وطن شام و فلسطین کے باشندوں کو توجہ دلائی کہ اس وقت جرمنی میں زندگی خود
 ہمارے ملک سے زیادہ ارزاں ہے لہذا جو لوگ تنگ دستی کی وجہ سے اپنی اولاد کو تعلیم نہیں دلا سکتے
 ان کو چاہیے کہ اپنے بچوں کو جرمنی بھیج دیں تاکہ وہاں کم سے کم خرچ پر جس کا اس زمانہ میں تصور
 کیا جاسکتا ہے۔ ان کو زمانہ حال کی بہترین تعلیم حاصل ہو جائے۔ میرا یہ مضمون قدس شریف کے جریڈ
 انٹیلج میں شائع ہوا، اور اس کے اثر سے تقریباً ۴۰ طالب علم برلین، لائپزگ، کولستانزا اور ووسٹ
 مقامات کی یونیورسٹیوں میں تحصیل علوم کے لیے پہنچ گئے۔ اس زمانہ میں جرمنی کی تعلیم اور وہاں کی
 زندگی کے متعلق جزئی معلومات فراہم کرنے کے لیے مجھے سوالات کی آہنی بوجھا رہی تھی کہ میں جواب
 دیتے دیتے عاجز آ گیا۔ آخر کار میں نے برلن میں ایک خاص مجلس اس غرض کے لیے قائم کر دی کہ
 لوگوں کو اس باب میں ضروری معلومات بہم پہنچاے۔

اس سلسلہ میں جن لوگوں نے مغربی تعلیم کے مسئلہ پر مجھ سے استفسارات کیے ان میں ایک
 صاحب فلسطین کے اکابر میں سے بھی تھے۔ انہوں نے مجھے لکھا کہ جرمنی میں میرے دو بچے تعلیم پا رہے ہیں
 ایک لڑکا ہے اور دوسری لڑکی ہے۔ لڑکے کی عمر ۶ برس کی ہے اور وہ ٹھنڈا یوم نامی مدرسہ میں
 داخل ہے۔ لڑکی ۱۲ سال کی ہے اور وہ وہاں کے ایک زمانہ مدرسہ میں پڑھ رہی ہے۔ صاحب خط
 نے مجھ سے ان دونوں بچوں کی تعلیم کے متعلق دریافت کیا کہ آیا ان دونوں کو وہیں تکمیل تعلیم
 رہنے دیا جائے یا وطن واپس بلا کر بقیہ تعلیم مکمل کرائی جائے۔ خصوصاً لڑکی کے مسئلہ میں وہ زیادہ متردد
 تھے، کیونکہ وہ سن رشد کے قریب پہنچ گئی تھی۔

میں نے ان کو جواب دیا کہ لڑکے کو وہاں تکمیل تعلیم کے لیے چھوڑا جاسکتا ہے بشرطیکہ اس
 کی عربی تعلیم کا بھی کافی انتظام ہو، کیونکہ جو عرب لڑکا بچپن سے عربی تعلیم حاصل نہ کرے اور جس کو
 اپنے عرب ہونے کا احساس نہ دلایا جائے، وہ خواہ تعلیم کے کتنے ہی اعلیٰ مدارج تک کیوں نہ پہنچ

جائے، اس کا شمار ہمارے شہر تہذیب کی صالح شاخوں میں نہیں ہو سکتا، بلکہ وہ ایک ٹہنی ہے جو ہمارے درخت سے کٹ گئی اور ایک دوسری کیاری میں بودی گئی۔ اب وہ ہم سے نہیں ہے اور ہمارے لیے اس کا وجود کچھ بھی مفید نہیں۔ رہا لڑکی کا معاملہ تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کو کیا جواب دوں، کیونکہ مجھے معلوم نہیں کہ اس باب میں آپ کا مشرب خاص کیا ہے، اور مسئلہ ایسا ہے جس کا تعلق ہر شخص کے اپنے مشرب سے ہے۔ آپ کے لیے یہ بھی ممکن ہے کہ بچی کو اب جرمنی سے بلا کر باقی تعلیم قدس شریف میں دلانیں، جہاں مجھ کو یقین ہے کہ اس کی تعلیم کے لیے کافی انتظام موجود ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اسے جرمنی میں رہنے دیں تاکہ وہ ایک اچھی جرمن لڑکی کی طرح اپنی تعلیم پوری کر کے نکلے۔ لیکن پہلی صورت میں آپ اپنی لڑکی کو بعض یورپین زبانوں اور علوم جدیدہ کے ساتھ ساتھ عربی زبان اور اسلامی عقیدہ کی تعلیم بھی دلوانا سکیں گے اور وہ ایک مسلمان لڑکی بن کر نکلے گی۔ اور دوسری صورت میں وہ بعض یورپین زبانوں اور جدید علوم تو ضرور سیکھ لے گی، مگر صرف نام کی مسلمان ہوگی اور محض عرف عام کے لحاظ سے اس کو عربیہ کہا جاسکے گا۔ پہلی صورت میں آپ کی بیٹی آپ ہی کی بیٹی رہے گی اور مسلمان کے سوا کسی کی بیوی نہ بنے گی۔ دوسری صورت میں وہ اگر چاہے گی تو آپ کی بیٹی رہے گی اور اگر نہ چاہے گی تو آپ کسی معاملہ میں اس کے ارادہ کو نہ روک سکیں گے، اور آپ کے لیے کسی وقت یہ خبر سننا خلاف توقع نہ ہوگا کہ آپ کی صاحبزادی، فلاں جرمن نوجوان کے دام محبت میں گرفتار ہو گئیں اور اس کے ہاتھ میں ہاتھ دیدیا، حتیٰ کہ یہ سن کر بھی آپ کو اچنبھا کرنے کا حق نہ ہوگا کہ اس نے ایک یہودی نوجوان سے محبت کی اور اپنی زندگی کو اس کے ساتھ منسلک کر دیا پس آپ خود ہی اپنے لیے دو صورتوں میں سے کوئی ایک صورت اختیار فرمایا ہے چونکہ میں اس مسئلہ میں آپ کے مشرب خاص سے واقف نہیں اور نہ آپ کے حجاب قلب کا حال مجھ کو معلوم ہے اس لیے میں نہیں کہہ سکتا کہ ان دونوں میں سے کونسی صورت آپ کو پسند ہے اور کونسی صورت آپ کے اختیار کرتے سے آپ کو درد و سزا لاحق ہوگا۔ آپ یہ بہرگز خیال نہ فرمائیں کہ میں آپ کو یہ صورت یا وہ صورت اختیار کرنے

کاشورہ دیر باہوں، یا آپ کے لیے ایک صورت کو دوسری صورت پر ترجیح دیر باہوں میں نے کوئی بات اس معنی میں نہیں کہی۔ میرے کلام کا مقصود صرف یہ ہے کہ اگر آپ اس بات کو برداشت کرنے کی قدر اپنے اندر نہیں پاتے کہ آپ کی صاحبزادی ہیٹ اور اسکرٹ پہن کر نکلے اور جو نوجوان اس کو پسند کرے اس کی کمر میں ہاتھ دے کر چلے اور جس سے چاہے خلا ملا پیدا کرے۔ خواہ وہ غیر مسلم ہی کیوں نہ ہو، اور وہ سب کچھ کرے جو آج مسلمانوں میں جدید ہے، تو آپ کے لیے یہی بہتر ہے کہ آج ہی اس کو جرمنی سے بلا لیں قبل اس کے کہ اس کی دلہنی کے امکانات کم ہو جائیں، کیونکہ کچھ مدت اور گزر جانے کے بعد اس کی خواہشات کے مرکز سے اس کو پھیر دینا آپ کی قدرت سے باہر ہو جائیگا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ وہ یقیناً کسی غیر مسلم سے شادی کرے گی اور حتماً جس جوان کو پسند کرے گی اس کے ہاتھ میں ہاتھ دے دیگی میں صرف یہ کہتا ہوں کہ اس کے ایسا کرنے کا امکان ہے، اور اگر وہ ایسا کرنا چاہے گی تو آپ اس کو نہ روک سکیں گے لیکن اگر آپ کا خیال یہ ہے کہ جو کچھ ایک جرمن یا کوئی اور یورپین کر سکتا ہے، وہی ایک مسلمان بھی کر سکتا ہے وہ بھی بشر ہے اور ہم بھی بشر ہیں جب ایک یورپین عورت کے لئے والدین کی رضامندی سے یا بلا رضامندی ایک مسلمان کے ساتھ شادی کرنا جائز ہے تو ایک مسلمان عورت کے لیے بھی ایک یورپین یا یہودی یا عیسوی یا ہندو سے رشتہ جوڑنا جائز ہونا چاہیے خواہ والدین راضی ہوں یا نہ ہوں، تو اس مشرب کے لحاظ سے میں آپ سے کہوں گا کہ اس کو جرمنی میں تکمیل تعلیم کر لینے دینے پسند دراصل بھان اور نظر کا ہے جو شخص اس طرف بھان کھتا ہے اس کے لئے یہ طریقہ ہے اور جو اس طرف بھان کھتا ہے اس کیلئے وہ طریقہ ہے لیکن اگر کوئی یہ چاہے کہ اپنی لڑکی کو یورپ بھی بھیجے اور ایسے مدارس میں پڑھائے جہاں نہ عربی کی تعلیم ہے نہ عقائد اسلامیہ کی اور پھر یہ بھی چاہے کہ وہ دین دار مسلمان عورت ہو اور اپنے ذوق اور مشرب میں لکھنوی عورت بن کر اٹھے، وہ دراصل اپنی لڑکی سے خرق عادت کا طالب ہے، جس کا صمد و محض اتفاقاً اگر ہو بھی جائے تو یہ خود اس کے فراہم کیے ہوئے اسباب کا فطری نتیجہ نہ ہوگا، بلکہ ایک اتفاقی امر ہوگا اور یہی

اتفاقی امر صیبا یہ کہ آپ کسی کوزہ پر کھلائیں اور وہ اتفاقاً جی نہجے۔

یہاں میں ایک مثال پیش کر دوں گا۔ ۱۹۱۹ء میں دستور عثمانی کا جب اعلان ہوا تو آزاد خیال ترکوں کے لیڈروں میں سے ایک شخص احمد رضا بک نے کہا۔

”جب تک ایک ترک نوجوان کو اتنی آزادی حاصل نہ ہو کہ وہ غلطی کے پل پر ایک ترک عورت کے ساتھ چل سکے اور عورت کا چہرہ نقاب سے مبرا ہو، اس وقت تک میں نہیں کہہ سکتا کہ ترکی میں کوئی دستور یا آزادی ہے۔“

یہ ابتدائی تھا۔ اب اس کی انتہا نیسے۔ حال میں یہ اطلاع مجھ کو پہنچی ہے کہ انقرہ کی پارلیمنٹ کے ارکان میں سے ایک شخص فلاح رفقی بک جو پہلے شام میں جمال پاشا کا سکرٹری تھا، اپنے ایک مضمون میں لکھتا ہے۔

جب تک ایک ترک لڑکی کو یہ آزادی حاصل نہیں ہے کہ جس سے چاہے اور جہاں چاہے

شادی کر سکے، خواہ وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم، بلکہ جب تک اس کو یہ آزادی حاصل نہیں ہے کہ جس مسلم یا غیر مسلم کے ساتھ چاہے رہ سکے اس وقت یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ترکیہ شاہ راہ ترقی پر پہنچ گئی ہے۔“

میں نے یہ تحریر خود نہیں دیکھی بلکہ روایت سننی ہے، اور میں سمجھتا ہوں کہ صحیح ہے۔

اب آپ دیکھ سکتے ہیں کہ مسئلہ صرف رفع حجاب کا نہیں ہے، اور نہ عورتوں کو مجبور دایا ہے

ذہاب کی آزادی دینے کا ہے۔ بلکہ یہ ایک طویل سلسلہ ہے جس کی کڑیاں باہم پیوستہ ہیں اور اسکی

معصوم ابتدا کو دیکھنے کے ساتھ ضروری ہے کہ اس کی ناگزیر انتہا تک بھی نظر نہ پھینچ جائے۔ جو شخص

عورتوں کی مطلق آزادی کا حامی ہے، وہ اگر اس سلسلہ کو انتہائی حدود تک قبول کرنے کے لیے

بخوشی آمادہ ہو، اور کمال ترقی اسی کو سمجھتا ہو کہ ایک مسلمان عورت جس نصرانی یا یہودی یا

مجوسی کے ساتھ چاہے نکاح یا سفاح کرنے میں آزاد ہو، تو مشکل دور ہو گئی، اور کوئی مزاح باقی

نہیں رہی۔ اس کے بعد اس بحث کی کوئی ضرورت ہی نہیں کہ حجاب بہتر ہے یا بے حجابی۔ البتہ اگر کوئی شخص حریت اور عدم حریت دونوں کو جمع کرنا چاہے پہلے اس کو آزاد چھوڑے کہ جہاں چاہے جائے جس سے چاہے ملے جتنے ہنسنے بولنے، کھیلنے سیر پانے کرے، پھر حجب اس کا دل کسی غیر سے الجھ جائے اور وہ اس کے ساتھ رہنا بنا شروع کر دے، اور قانونی یا غیر قانونی تعلق قائم کرے تو حریت اور غیرت کا جوش بھڑک اٹھے، تو میں کہوں گا کہ یہ غلط ہے، خلاف عدل ہے، عقل اور منطق کے منافی ہے۔

حال میں حجت العرب، اساذ سید مصطفیٰ صادق الرافعی نے ایک کتاب لکھی ہے جو عربی لٹریچر کی بہترین کتابوں میں شمار کرنے کے لائق ہے۔ اس میں انہوں نے ایک مصری نوجوان کے ساتھ اپنی ملاقات کا حال لکھا ہے جو یورپ سے تحصیل علم کر کے تازہ تازہ آیا ہوا تھا اور اس پر فرنگیت پوری طبع سلطنتی۔ وہ لکھتے ہیں کہ :-

میں نے اس نوجوان سے پوچھا کیا تم مصری ہو؟ اس نے جواب دیا ”پورا اور پتلا“ میں نے کہا کیا تم اپنے علم اور تہذیب کی بنا پر اپنے آپ کو اس لائق سمجھتے ہو کہ تمہارے نونے پر تمہارے ابنائے ملک کا نشوونما ہو؟ اس نے کہا میں اس کی توقع رکھتا ہوں۔ میں نے کہا کیا تم ستر عورتوں کی آزادی مطلق اور مردوں کے ساتھ ان کی پوری مساوات کے قائل ہو اور ان قبیلوں سے ان کو نکال لانا چاہتے ہو جن کا نام گھڑیے؟ اس نے کہا یہ تو میرا مذہب ہے میں نے کہا تمہاری کیا رائے ہے اگر مصری مرد یورپین عورتوں سے شادیاں کریں اور ان سے اپنے گھروں کو آباؤ کریں؟ اس نے کہا غالباً ہمارے ملک کی بہتری کے لیے اس سے بہتر کوئی تجویز نہیں ہو سکتی، کیونکہ اس سے ہماری نسلوں میں تازہ خون آئے گا، اور ہماری سوسائٹی میں نظم اور شائستگی پیدا ہوگی اور ہماری معاشرت کی تعمیر نئی بنیادوں پر شروع ہو جائے گی۔ میں نے کہا بارک اللہ

آپ نے خوب فرمایا۔ اب اگر ہم آپ سے مسادات کی درخواست کریں اور کہیں کہ اپنی بہن کو بھی کسی یورپین مرد سے دوستی کرنے اور اس کے ساتھ نکل یا ازدواج مدنی کر لینے کی اجازت دین تاکہ وہ بھی ایک یورپین مرد کو آئے جس طرح آپ ایک یورپین عورت لے کر آئے ہیں پھر ہر مصری عورت اسکی تقلید کرے اور مصری عورتوں کا رشتہ بھی فرنگیوں کے ساتھ قائم ہو جائے تو فرمائیے کہ اس باب میں جناب کی کیا رائے ہے؟ اس نے کہا اعود باللہ میں نے کہا خدا تمہاری عقل درست کرے کیا تمہاری غفلت اس حد کو پہنچ گئی ہے کہ جب تک اللہ کی لعنت کو تم اپنی پوری قوم میں لبریز نہ دیکھ لو اس وقت تک تم کو احساس نہیں ہوتا کہ یہ اللہ کی لعنت ہے اور کیا تم اپنی قوم کا حق اس وقت پہچانتے ہو جب اس کے مٹنے کا وقت قریب آجائے؟ اس نے کہا میں اور مجھ جیسے لوگ شاد ہیں، مگر قاعدہ کو تو ہمیشہ قاعدہ ہی رہنا چاہیے۔ میں نے کہا کہ تم پر اور تمہارے قاعدہ پر خدا کا غضب ہو۔ بخدا ہمارے ملک کا تم جیسے لوگوں کے وجود سے پاک ہو جانا اس سے بدرجہا بہتر ہے کہ تم ہمارے درمیان رہ کر اختلاط انساب کا فتنہ برپا کرو اور عربیت اور اسلامیت کی جڑیں اکھاڑو۔

یہاں ہمارے مقصد کے لیے اس ذرا فنی کی صرف اتنی عبارت کافی ہے جو نتیجہ ہم بیان کرنا چاہتے ہیں وہ حاصل ہو گیا، اور وہ یہ ہے کہ عورت کے مسئلہ میں یورپ والوں کی قدم بدم پیروی کرنے کے چند توابع اور لوازم ہیں جن سے اس ملک کو جدا نہیں کیا جاسکتا۔ اگر ہم اس سلک کو اختیار کریں تو ان ناگزیر توابع و لوازم کو بھی ہمیں قبول کرنا پڑے گا۔ پھر اعود باللہ کہنے کا کوئی موقع نہیں۔ بلکہ وہاں اعود باللہ پایا ہی نہیں جاتا۔ وہ ایک تہذیب ہے اور یہ ایک دوسری تہذیب ہے۔ وہ ایک نظریہ ہے اور یہ دوسرا نظریہ ہے، ہم ان دونوں میں سے کوئی ایک ہی تہذیب اور ایک ہی نظریہ اختیار کر سکتے ہیں۔ دونوں کا اجتماع ممکن نہیں ہے کہ ایک طرف آپ دوسری تہذیب بھی اختیار کریں اور جب وہ اپنے طبعی نتائج کے ساتھ پھل پھول

لائے تو اعود باللہ بھی کہیں۔

آپ نے دیکھا! جب اسٹاذ رافعی نے اس مصری نوجوان سے کہا کہ کیا تم اپنی بہن کا کسی یورپین مرد کے ساتھ اختلاط گوارا کر سکتے ہو، تو اس نے کہنے کو اعود باللہ کہدیا، مگر فوراً ہی اس کے دل میں کھٹک پیدا ہوئی کہ یہ اعود باللہ تو اس قاعدہ کے خلاف ہے جس کے متعلق اس نے چند ہی لمحوں پہلے دعویٰ کیا تھا کہ اصلاح اس کے بغیر نہیں ہو سکتی، یعنی وہی قاعدہ کہ عالم مغربی کی طرح عالم اسلامی میں بھی عورتوں کو حریت مطلقہ حاصل ہو اور وہی قاعدہ جس کو فالج رفقی بک نے بیان کیا ہے، اور وہی قاعدہ جس کو ڈاکٹر عبداللہ جو دت نے پیش کیا تھا کہ ترکی نسل میں تازہ خون بہم پہنچانے کے لیے جرمن اور آئالین قوموں سے شادی بیاہ ہونا چاہیے (جس پر ایک ترک نوجوان نے بگڑ کر کہا کہ ہم ترکوں کے خون کی طہارت اس سے بالاتر ہے کہ ہم اس کو پاک کرنے کے لیے یورپ والوں سے خون لیں) پس جب یہ قاعدہ قبول کر لیا جائے تو اس کے لازمی اثرات مترتب ہونے پر اعود باللہ کہنے کا کیا موقع ہے؟ لہذا اس نے چونک کر پھر کہا کہ میں اور مجھ جیسے لوگ شاذ ہیں، مگر قاعدہ کو تو ابداً قاعدہ ہی رہنا چاہیے۔ دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم تو ہمیشہ سلطان ہم ہی کے ماتحت رہیں گے۔ اور یہ جو اپنی بہنوں کو یورپ والوں کے حوالہ کرنے سے ہم انکار کرتے ہیں، تو یہ بھی اقتضائے عقل و حکمت کی بنا پر نہیں ہے، بلکہ اسی وہم کے اتباع میں ہے۔ یعنی وہ قاعدہ جو اباحت کا مقتضی ہے، وہ تو اپنی جگہ صحیح ہے، مگر ہمیں علانیہ اس کی اجازت دیتے ہوئے شرم آتی ہے کہ ہماری بہن کسی غیر مسلم نوجوان کے ساتھ ربط ضبط پیدا کرے اور نکاح شرعی کے بغیر اپنے نفس کو کسی کے حوالہ کر دے۔ ہم پر ابھی تک پھیلی تہذیب کا اثر ہے اس لیے ہمیں شرم آتی ہے۔ مگر ہمیں امید ہے کہ ہمارے بیٹوں یا پوتوں میں یہ چیز باقی نہ رہے گی۔

۱۹۵۵ء میں وہ مصری پارلیمنٹ سے اس قسم کی آزادی کو جائز تسلیم کرالیں گے۔

بہت سے لوگ جو میرے اس مضمون کو پڑھیں گے مجھے اندیشہ ہے کہ وہ اس موقع پر
منہ بجا کر بول اٹھیں گے کہ یہ کیا تم نے کہنا شروع کر دیا۔ اباحت اس حریت مطلقہ کے لوازم
میں سے نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ہم عورت کی آزادی کے حامی بھی ہوں اور دین و عصمت کے پڑا
بھی۔ جائز ہے کہ ہم بے پردگی کی دعوت تو دیں مگر ہم اپنی بہنوں کا غیروں کی زینت آغوش بنا
پسند نہ کریں ہم ہرگز یہ نہیں سمجھتے کہ جن قوموں نے اپنی عورتوں کو آزادی دے رکھی ہے، اور جو پردے
کے نام تک سے نا آشنا ہیں وہ مردوں کی نیک چلنی اور عورتوں کی عصمت کی قدر کرنے میں ہم سے
کچھ کم ہیں۔ عورتوں کی حریت کے ساتھ ان کی تنسیم بھی تو ہے۔ اور عورت جب تعلیم یافتہ اور منہ
ہو جاتی ہے تو اس کا علم اس کے لیے وہ حجاب بن جاتا ہے جو اسے فحش کاری سے روکتا ہے۔ یہ
اور ایسی ہی بہت سی باتیں ضرور کہی جائیں گی جن کی بخت تھوڑا ہو چکی ہے۔ مگر میں اپنے ان دوستوں
سے کہوں گا کہ ٹھیرو! ٹھیرو! جلد بازی سے کام نہ لو۔ تم بحث کے مختلف گوشوں کو خلط ملط
کر رہے ہو، اور اس بحث کے اتنے گوشے ہیں کہ ان سب کا احاطہ ایک مقالہ میں نہیں ہو سکتا بلکہ اس
کے لیے دو تین مقالے بھی کافی نہیں ہیں۔ عصمت اور صیانت اور حفظ انساب اور اطاعت احکام
دین کے ساتھ جو آزادی اور روکٹائی ممکن ہے وہ صرف اس حد تک ہے کہ عورت اپنی ضروریات
کے لیے گھر سے باہر نکلے، چلے پھرے، حسب ضرورت چہرہ بھی کھول لے۔ شریعت اس کی اجازت
دیتی ہے۔ اس نے چہروں کو ڈھا سنا فرض نہیں کیا ہے، نہ وہ اس کا حکم دیتی ہے کہ عورت
جیتے جی مدفون ہو جائے۔ مگر تم کو نہ بھولنا چاہیے کہ یہ آزادی اور روکٹائی غیر مردوں کے
ساتھ خلافاً، اور غیر مسلمانوں کے ساتھ اختلافاً کی حد تک نہیں ہے۔ اور اگر مسئلہ اسی حد تک
محدود رہے تو اس میں وہ ترقی ممکن نہیں جس کو فالج رفیق اور عبد اللہ جودت اور مصری نے
اور ایسے ہی بہت سے حضرات ترقی سمجھتے ہیں کیونکہ اس ترقی کیلئے صوفیاتی آزادی تو کافی نہیں ہے کہ

ایک مسلمان عورت گھر سے باہر نکل سکے اور حسب ضرورت چہرہ کھول سکے۔ اس درجہ آزادی کے متعلق تو وہ بھی جانتے ہیں کہ وہ شریعت میں جائز ہے، اور صدیوں تک مسلمان عورتیں اس مستفید ہوتی رہی ہیں، وہ نکلتی تھیں لین دین کرتی تھیں، بڑے بڑے کاموں میں مردوں کے ساتھ شریک ہوتی تھیں اور شریعت ان کو نہ روکتی تھی۔ اس حد سے بڑھ کر جو حجاب ہے، وہ فرط غیرت کا نتیجہ ہے نہ کہ حکم شریعت پر مبنی لیکن یہ درجہ تو اس گروہ کے نزدیک ترقی کا دنی درجہ ہے۔ وہ جس آزادی کے طالب ہیں وہ بعینہ وہ آزادی ہے جو یورپین عورتوں کو حاصل ہے یعنی زینت و آرائش کے ساتھ نکلنا، جسم کے محاسن کو نمایاں کرنا۔ مردوں کے ساتھ خلوت و جلوت میں گھلنا ملنا، اور ازدواج میں اپنی خواہش نفس کے سوا کسی ضابطہ کا پابند نہ ہونا۔ اب میں کہتا ہوں کہ اگر یہی وہ چیز ہے جس کے تم طالب ہو تو پوری جرأت کے ساتھ اس کا اور اس کے تمام توابع اور متمات کا صاف اقرار کرو، اور اس مصری نوجوان کی طرح اس کے بعض شرم ناک پہلوؤں، اعود باشندہ کہنا چھوڑ دو، کیونکہ آخر یہ بھی تو ایک نظر یہ ہے، اور تمدن دنیا کے کروڑوں آدمی اس نظریے کے قائل اور اس پر عامل ہیں، کیا حرج ہے کہ تم بھی ہیئت اجتماعیہ میں ان کے ساتھ شریک ہو جاؤ۔ لیکن اگر تم ایک طرف اس حریت مطلقہ کے بھی طالب ہو اور دوسری طرف یہ بھی چاہتے ہو کہ مسلمان عورت عفت و عھمت اور ازدواج کے معاملات میں اسلامی حدود کی پابند رہے تو ہم کہیں گے کہ یہ نقتضین ہیں، ان کا اجتماع ممکن نہیں ہے۔ ایک جہت سے غیر مقید آزادی اور دوسری جہت سے صرف مسلمان کے ساتھ تعلق اور کلیتہً شرعی تعلق کی قید! کونسی منطق ہے جو ان دونوں کا اجتماع ثابت کر سکتی ہے؟

اگر تم اس مقید آزادی پر قناعت کر سکتے ہو جس کا ہم نے ذکر کیا ہے، تو شریعت اس کی پوری پوری ضمانت دیتی ہے، اور اس سے تم کو نہیں روکتی۔ اور اگر تم اس مطلق اور کھل چ

کے طالب ہو جو یورپ کی عورتوں میں پائی جاتی ہے تو خوب جان لو کہ اسلام اور ایسی آزادی یا ہم مجتمع نہیں ہو سکتے جس کا حجابی چاہے اسلام کو اختیار کرے اور جو چاہے اس آزادی کو اختیار کرنے۔ صرف یہی نہیں کہ اسلام اس کا مخالف ہے۔ بلکہ نفاقِ انیت بھی اس کی مخالف ہے۔ نفاقِ انیت بھی مرد و زن کے اختلاط بلا نخل کو جائز نہیں رکھتی اور غیر مسیحی مرد کے ساتھ مسیحی عورت کے اقتران کو روکتی ہے۔ بلکہ اس معاملہ میں مسیحیت کی قید اسلام سے بھی زیادہ سخت ہے اسلام نے صرف مسلمان عورت پر یہ پابندی عائد کی ہے کہ وہ مسلمان کے سوا کسی سے نخل نہ کرے مسلمان مرد کو وہ اس کا پابند نہیں بناتا۔ مگر مسیحیت مرد اور عورت دونوں پر یہ پابندی عائد کرتی ہے کہ وہ صرف مسیحی سے ازدواجی تعلق قائم کریں پھر دین مسیحی اپنے پیروؤں کو طلاق کے معاملہ میں بھی زیادہ سخت قوانین سے جکڑتا ہے۔ وہ مرد اور عورت دونوں سے طلاق کا حق سلب کرتا ہے اور اگر وہ اس کا اقدام کریں تو ان کے نخل ثانی کی اجازت نہیں دیتا۔ اس سے ظاہر ہے کہ دین مسیحی میں بھی عورت کی حریت مطلق ہے اور نہ تام۔ یورپ اور امریکہ میں جو لوگ ان قوانین کے خلاف عمل کر رہے ہیں وہ مسیحیت کے پابند نہیں ہیں۔ اور جو مسیحیت کے پابند ہیں وہ عورت کی حریت مطلقہ کے قائل نہیں ہیں۔

یہی بات کہ جن قوموں میں حجاب نہیں ہے وہ عورتوں کی عفت و صدیانت میں ان قوموں سے کم نہیں ہیں جو حجاب کی قائل ہیں، تو یہ ایک غلط بات ہے۔ اس معاملہ میں ان دونوں کے درمیان بہت بڑا فرق ہے۔ اس فرق کو اگر آپ دیکھنا چاہتے ہیں تو مشرق کے عیسائیوں کو مثال میں لیتے، کیونکہ وہ بھی ہماری ہی طرح مفید آزادی کے قائل ہیں اور جن امور میں عفت کے لیے خطرہ ہے ان کو جائز نہیں رکھتے۔ صحیح مقابلہ عالم اسلام اور یورپ کے درمیان ہے، اور کون کہہ سکتا ہے کہ عفت اور صدیانت اخلاق میں یورپ کا وہی درجہ ہے

جو عالم اسلامی اور عالم نصرانی شرقی کا ہے ؟ بورپ کے ایک شہر پیرس میں جو فسق و فجور ہو رہا ہے، صرف وہی تمام عالم اسلامی کے مجموعی فسق و فجور سے مقابلہ کرنے کے لیے کافی ہے !

اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ سرنِ تعلیم کے اثر سے عورت اخلاق کے اُس بلند مرتبے پہنچ سکتی ہے جہاں حجاب اور شوہر کی حفاظت سے وہ بے نیاز ہو جائے، تو باوجودیکہ ہم تعلیم کے فائدے بنانے والے اور اخلاق کو سونارنے والے اثرات کے منکر نہیں ہیں یہ کہنا ہمارے لیے ممکن نہیں کہ وہ اس معاملہ میں بجائے خود کافی ہے اور اس کے بعد قیود شرعیہ اور حفاظت زوجہ کی حاجت باقی نہیں رہتی۔ کیونکہ تعلیم (اور خصوصاً وہ تعلیم جو آج کل دی جا رہی ہے) نہ تو خوف کی قائم مقام ہے اور نہ تنہا اتنی قوت رکھتی ہے کہ انسان کو قانون اور اخلاق کی حدود سے تجاوز کرنے میں مانع ہو ہم جانتے ہیں اور روز مرہ دیکھتے ہیں کہ جو لوگ علم کے اعلیٰ مقام تک پہنچ گئے ہیں، ان کے علم و فضل نے ان کی عفت اور پاک دامنی اور افعالِ قبیحہ سے اجتناب میں کچھ بھی اضافہ نہیں کیا۔

مشرق کے باشندے علم میں مغرب سے بہت پیچھے ہیں، مگر فسق و فجور جتنا وہاں پایا جاتا ہے اتنا یہاں نہیں پایا جاتا، اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ یہاں مذہب کا اثر زیادہ گہرا ہے، اور عورتوں پر مردوں کی قوامیت باقی ہے مسلمان اور مشرقی سچی عورت اپنے خدا سے بھی ڈرتی ہے اور اپنے شوہر سے بھی، اگرچہ وہ جاہل ہے، بخلاف اس کے اکثر و بیشتر مغربی عورتیں اب اس حال میں نظر آتی ہیں کہ نہ ان کو خدا کا خوف ہے نہ شوہر کا، اگرچہ وہ بہت تعلیم یافتہ ہیں۔

اب ایک اعتراض اور باقی ہے جو یقین ہے کہ ان حضرات کی طرف سے ضرور پیش کیا جائے گا جو اپنے آپ کو "تجدید خیال" کہلانا پسند کرتے ہیں، اور جن کو دعویٰ ہے کہ ہم اولیٰ اور عقائد سے آزاد ہیں اور محض عقولِ علمیہ اور بصائرِ رفینہ کے بل پر حادہ ترقی میں کام لیں ہیں۔ وہ کہیں گے کہ ایک مسلمان جو اپنی بہن یا بیٹی کو کسی مسیحی یا یہودی یا بت پرست کے ہلو میں رکھ

نفرت کرتا ہے، یا ایک سچی جو اس کو گوارا نہیں کرتا کہ اس کی بہن یا بیٹی کسی مسلم یا یہودی یا ہونسی کی بیوی بنے، یہ سب اوہام اور رسوخ عقائد کی تاثیرات ہیں، بلکہ یہ محض وساوس ہیں جن کو حقائق سے کچھ واسطہ نہیں۔ اسی طرح ایک مسلم یا مسیحی کے کسی مرغوب خاطر مرد کے ساتھ ربط ضبط پیدا کرنے پر جو ناک جھوں چڑھائی جاتی ہے، یہ بھی اوہام و وساوس کا نتیجہ ہے جو شدت سکار اور مرور زمان کی وجہ سے شرف اور غیرت اور حمیت بن گیا ہے۔ علم کا کام یہ ہے کہ ان اوہام سے دلوں کو پاک کر دے اور ان میں حقائق کے سوا کسی اور چیز کے لیے گنجائش ہی نہ رہنے دے۔ دور حاضر کی بیداری کو جو سب سے بڑی خدمت انجام دینی ہے وہ تو اوہام کا استیصال اور خرافات کی فرما زوائی کا قلع و قمع ہی ہے۔

اگر کسی کی طرف سے یہ اعتراض پیش کیا جائے تو ہم کو پھر اسی قاعدہ کی طرف رجوع کرنا پڑے گا جو فالج رفقی اور عبداللہ جو دت اور اس مصری نوجوان نے بیان کیا ہے۔ یہاں ہم اس سوال سے بحث کرنا نہیں چاہتے کہ یہ قاعدہ بجانے خود صحیح ہے یا غلط۔ ہم صرف کہیں گے کہ اگر تم یورپین تہذیب اور اس کے نظریات کو اسلام اور عفت و طہارت کے متعلق اس کے نظریات پر ترجیح دیتے ہو تو علانیہ ایک کو چھوڑ کر دوسرے کو اس کے تمام لوازم اور مہتمات سمیت اختیار کر لو اور جب اس کے ایسے شرمناک پہلو سامنے آئیں جو کسی طرح اس سے منفق نہیں ہو سکتے تو اس کے دامن بچانے کے لیے کج بحثیاں کرنا چھوڑ دو۔ پھر ہمارے اور تمہارے درمیان کوئی بحث باقی نہ رہے گی۔ البتہ اگر تم عفت اور طہارت کے ان اصولوں کا التزام کرو جو اسلام اور شرعی تہذیب میں پائے جاتے ہیں اور عورت کے اخلاق میں عصمت کو وہ اہمیت دو جو ایک مسلمان اور شرعی دیتا ہے، اور اولاد کے صرف اپنے باپ کی صلب سے پیدا ہونے کا اطمینان کرنا اتنا ہی ضروری سمجھو جتنا ہماری ملت میں سمجھا جاتا ہے تو اس بنیاد پر ہم اور تم بحث کر سکتے ہیں کہ ان اغراض

کے لیے وہ مقید آزادی زیادہ مفید ہے جو اسلامی شریعت نے عورت کو دی ہے، یا وہ غیر مقید آزادی جو یورپ نے اسے بخش رکھی ہے۔

پھر میں ان سے یہ بھی کہوں گا کہ انسان جب تک انسان ہے اور جب تک اس کے وجود کی یہ ترکیب باقی ہے، مکن نہیں کہ وہ اُس چیز سے خالی ہو جس کو "اؤٹ لیم" اور عقائد سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اگر وہ ان چیزوں کو چھوڑ کر صرف حقائق مجردہ کی بنیاد پر زندگی بسر کرے تو اس کی زندگی بہائم کی زندگی سے شبہ ہو جائے گی۔ مثال کے طور پر اگر حقیقت مجردہ کے لحاظ سے دیکھا جائے تو نخل اور سفاح دونوں ایک نظر آئیں گے۔ عمل کے لحاظ سے اس شخص میں جو نخل کرتا ہے اور اس شخص میں جو زنا کرتا ہے، قطعاً کوئی فرق نہیں۔ پھر کیا چیز ہے جس کی بنا پر ایک شخص اپنی بیوی کی عصمت میں ذرا سا بھی شبہ پاتا ہے تو اسے طلاق دے دیتا ہے، اور اگر وہ کسی غیر کو اس کے ساتھ ملوث پا کر قتل کر دے تو دنیا کا کوئی قانون حتیٰ کہ جدید ترین جمہوری دنیا فریضی قانون بھی اس کو مجرم نہیں سمجھتا، تم کہو گے کہ یہ صرف اس وجہ سے جائز ہے کہ زانیہ ایک ایسی عورت سے متنع کرتا ہے جو ایک دوسرے شخص کی بیوی بن چکی ہے۔ مگر میں کہوں گا کہ اگر وہی عورت برضا و رغبت کسی اور شخص سے بھی ویسا ہی تعلق قائم کرے تو شوہر کے لیے کیوں جائز ہے کہ اس کو قتل کر دے اور وہ غریب اسی فعل کی پاداش میں کیوں مارا جائے جو باعتبار مجرد حقیقت خود شوہر کے فعل سے کچھ بھی مختلف نہیں؟ آخر کیا وجہ ہے کہ نوع انسانی کا اکثر و بیشتر حصہ اس پر متفق ہو گیا کہ یہ فعل سب سے بڑا گناہ ہے اور اس کی ناپاکی سب ناپاکیوں سے بڑھ کر ہے، اور خاندان کے شرف و مجد کو تباہ کرنے والی کوئی چیز اس سے زیادہ نہیں؟ یہ سب آخر کیوں ہے؟ اور پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ مرد و زن کا جو تعلق صورت شرعیہ کے بغیر انسان کی نگاہ میں آنا برائے وہی تعلق جب رو آدمیوں کی گواہی یا ایک کاغذ کی خاتہ پر ہی سے قائم ہوتا ہے تو ناموس ^{عظا} ^م

عمل شریف بن جاتا ہے، خود باپ اپنی بیٹی کو شادان و فرحان ایک شخص کے حوالہ کرتا ہے، اور
 عدس کے رشتہ دار اس پر خوشیاں مناتے ہیں، اور اسی بات پر مبارکبادیں قبول کرتے ہیں
 جو اگر اس طریقہ سے انجام نہ پاتی تو وہ کٹ مرنے پر تیار ہو جاتے؟ جواب میں یہی کہا جاسکتا ہے
 کہ یہ فیصلہ اگرچہ بقائے نوع اور تناسل کے لیے دونوں حالتوں میں یکساں ضروری ہے، لیکن
 انسان نے مدتوں سے یہ ٹھہرا لیا ہے کہ اتفاق شرعی کے ساتھ وہ حلال اور قابل فخر اور موجب
 تہنیت و شادمانی ہے، اور معاملہ شرعیہ کے بغیر فضیلت اور جنابت اور گناہ کبیرہ ہے۔ یہ دونوں
 اعتبار جو دونوں میں راسخ ہو گئے ہیں ان کی کوئی بنیاد بجز اس کے نہیں کہ ایک غیر معلوم زمانہ
 نوع بشری میں یہی قاعدہ چلا آ رہا ہے، اور بالکل یہ وہم ہی ہے جس کو نفس عمل کی طبیعت سے
 کوئی علاقہ نہیں۔ یہ وہم خواہ کتنا ہی مقدس ہو مگر اس کا تقدس ہونا اس کو مجرد ایک اصطلاح اور قرار
 اور وہم ہونے سے خارج نہیں کرتا۔

اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انسان جب تک انسان ہے اس کے لیے یہ ممکن نہ
 اس کے اعمال سر اس طبیعت اور مجرد حقیقت پر مبنی ہوں، اور اوہام و عقائد کا ان میں کچھ بھی دخل
 نہ ہو، حیوانات کے سوا کوئی مخلوق نہیں جس کے اعمال ”اوہام“ و خیالات سے خالی ہو کر صرف
 حکم طبیعت پر قائم ہوں۔

اسباب زوال امت

علامہ امیر شکیب ارسلان کوہم نے لکھا تھا کہ کوئی ایسی چیز سمجھے جو آپ کے
 نزدیک مسلمانوں کے لئے مفید ہو۔ علامہ موصوف نے اس کے جواب میں ایک نہایت ہی اہم رسالہ
 ارسال فرمایا ہے مسلمانان ہندوستان نے ایسا عظیم مفید اور ولولہ انگیز مضمون بہت کم دیکھا ہو گا۔ تین آنے
 کے ٹکٹ بھیج کر ایک کتاب منگو ایس اور سو روپیہ کی آٹھ کتابیں طلب فرمائیں سودہ کا حجم ۱۴۱ ہے۔
 (پتہ) سکریٹری ریرت کیٹی ٹی اے ضلع لاہور۔